67

شریعت کے احکام بے چون وچرا مانو

(فرمودہ ۱۹ / دسمبر ۱۹۱۹ء)

حضور نے تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد آیت شریفہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۔ (النساء: ۶۰) تلاوت فرمائی اور فرمایا:۔

اسلام ایک ایسے زمانہ میں دُنیا میں آیا ہے۔ جبکہ حریت خواہ فکر کی ہو۔ خواہ عمل کی۔ بالکل مٹی ہوئی تھی متمدن دُنیا میں حریت فکر و حریت عمل بالکل مفقود تھی۔ دو بڑی حکومتیں تھیں۔ ایران جو ایشیا کے بڑے حصہ پر تصرف رکھتی تھی۔ اور دوسری یونانی حکومت جسے رُومی سلطنت کہتے ہیں۔ اس کا ایشیا کے بعض حصص پر اور افریقہ کے متمدن حصہ پر اور تمام یورپ پر اثر تھا ان دونوں حکومتوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں دونوں باتیں نہ تھیں۔ نہ تو وہاں لوگوں کے دماغوں کو آزادی حاصل تھی۔ کہ وہ کسی امر کے متعلق کچھ سوچ کر اور کوئی رائے قائم کر سکیں۔ اور نہ یہ آزادی تھی کہ کسی قسم کی حرکت کر سکیں۔ حکومت کا جبر اتنا بڑھا ہوا تھا کہ رعایا اور حکام کے تعلقات ایسے تھے کہ رعایا جانور ہے۔ اور حکام ان کے مالک وہ جس قسم کا رعایا سے سلوک کریں۔ وہ بجا اور درست ہے۔ چنانچہ حکام جو چاہتے تھے۔ اور جس طرح چاہتے تھے۔ رعایا سے کرتے تھے۔

اس کے مقابلہ میں غیر متمدن علاقوں کی حالت حریت کے لحاظ سے حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی مثال عرب میں ملتی ہے۔ عرب میں اس وقت کوئی تہذیب نہ تھی کوئی تمدن نہ تھا۔ کوئی قانون اور قاعدہ نہ تھا۔ وہاں آزادی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ جو چاہتے کرتے تھے۔ کوئی پُرسان اور کوئی مانع نہ تھا۔ انہوں نے آزادی کے معنے یہ سمجھ رکھے تھے کہ کسی امر میں کسی کی پرواہ نہ کی جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں بعض قوانین تھے۔ لیکن وہ اس قدر وسیع تھے کہ جس کی حد نہیں۔ مثلاً ان میں یہ قانون تھا کہ کوئی

شخص بیشک بُتوں کی پرستش نہ کرے۔ کوئی بتوں پر ایمان نہ لاتے۔ اور ان کی جگہ خدا پر ایمان رکھے مگر وہ اس بات کا انکار نہ کرے۔ کہ بتوں میں کسی قسم کی طاقت نہیں۔ اگر ایک شخص بتوں کو نہ مانتے ہوتے مگر ان کی طاقتوں کا انکار نہ کرتے ہوتے عیسائی ہوتا یا یہودی ہوتا۔ یا موحد ہوتا۔ تو وہ مختلف عقیدے رکھکر عرب کی سرزمین میں رہ سکتا تھا۔ اگر بندش تھی تو یہ کہ بُتوں کے خلاف کسی قسم کی رائے کا اظہار نہ ہو۔ نہ لوگوں کو اُن متعلق اُکسائے اگر یہ نہ کرے۔ تو ایک شخص عیسائیت کو قبول کر کے عرب میں رہ سکتا تھا۔ نہ صرف عرب میں بلکہ ۔۔ میں رہ سکتا تھا۔

یہ تو ہوئی حریتِ فکر۔ حریتِ عمل یہاں تک بڑھی ہوئی تھی۔ کہ اس کے متعلق ایک مشہور واقعہ ہے کہ عرب کے ایک حصّہ کے ایک عرب بادشاہ نے اپنے درباریوں سے سوال کیا۔ کہ کوئی ایسا ہے جو میری اور اُس کی ماں میری ماں کی اطاعت نہ کرے۔ انہوں نے جواب دیا کہ فلاں قبیلہ کا سردار ہے۔ جو بڑا بادشاہ بھی نہیں وہ آپ کی اور اُس کی ماں آپ کی ماں کی اطاعت نہیں کریں گے۔ بادشاہ نے اس کو کہلا بھیجا کہ بادشاہ کو آپ کے، اور بادشاہ کی ماں کو آپ کی ماں کو دیکھنے کا شوق ہے۔ اس سردار کا نام عمرو ابن الکلثوم تھا۔ وہ اپنی ماں سمیت گیا۔ اس کی ماں بادشاہ کی ماں کے خیمہ میں ٹھہری۔ اور وہ بادشاہ کے خیمہ میں۔ جب کھانے کا وقت آیا۔ تو بادشاہ کی ماں نے حکمتِ عملی سے چاہا کہ اس عورت سے کام لے۔ اس لیے اس نے اس عورت کو کہا، کہ وہ برتن پکڑانا۔ میں کھانا لگا کر باہر تمہارے اور اپنے بیٹے کے لیے کھانا بھیج دوں۔ بظاہر یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ نہ اس میں ہتک کا سوال تھا۔ کیونکہ وہ خود تقسیم کرنے بیٹھی تھی اور جن کو باہر کھانا بھیجنا تھا اُن میں اُس کا بیٹا بھی تھا، لیکن اُس نے اس کو اپنی ہتک کا موجب قرار دیا۔ اور کھڑی ہو کر زور سے اپنے قبیلہ کو پکارنے لگی۔ کہ اے فلاں قبیلہ والو! تمہارے سردار کی ماں کی ہتک کی گئی۔ اس آواز کا بلند ہونا تھا۔ کہ اس کا بیٹا جو بادشاہ کے خیمہ میں تھا۔ فوراً کھڑا ہو گیا۔ اور کھڑے ہوتے ہی خیمہ کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک طرف بادشاہ کی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس نے فوراً اس کو کھینچ لیا۔ اور بادشاہ کا سر اُڑا دیا، کہ تحقیق بعد میں کروں گا۔ پہلے ماں کی ہتک کا بدلہ تو لے لوں۔ خیمہ سے باہر نکلا۔ اور قبیلہ کے جو چند آدمی ساتھ تھے۔ ان کو کہا کہ فوراً جو کچھ لوٹ سکتے ہو لوٹ لو[1]

تو اتنی وہاں حُریت تھی کہ بُتوں کو بُرا کہنے کے سوائے کوئی مذہب رکھو۔ اور ایسی حالت میں وہاں مختلف مذاہب کے لوگ بستے تھے۔ اگر ان کو کسی بات سے دشمنی تھی تو اس سے کہ وہ بُتوں کے خلاف

---

[1] الاغانی جلد ۹ صہ ۱۸۱

وعظ نہیں سُن سکتے تھے۔ مگر باوجود اس کے جب اسلام آیا۔ تو اس کو دونوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ اول تو یہ کہ کسی کی بات کو نہ ماننا اس حالت کو دُور کرنا تھا۔ دوسرے جن متمدن ممالک میں غلامی اور رعایا کا ایک ہی مفہوم سمجھا جاتا تھا۔ اس کو دُور کر کے حُریت عمل و فکر کو قائم کرنا تھا۔ چنانچہ اسلام نے ایک وسطی طریق اختیار کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متمدن دُنیا کو یہاں تک حقوق دیتے گئے کہ وہاں کے باشندے اپنے ہم مذہبوں کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ مل گئے۔ افراد کو ان کے حقوق اتنے دیئے گئے۔ کہ وہ زبردست ہو گئے۔ لکھا ہے کہ ایک علاقہ پر مسلمان متصرف ہو گئے۔ مگر وہاں کے لوگوں کو مخالفوں کی طرف سے کچھ اذیت پہنچی۔ جس کا مسلمان تدارک نہ کر سکے۔ اس سے متاثر ہو کر مسلمان گورنر نے وہاں کا مالیہ اور جزیہ وغیرہ واپس کر دیا۔ کہ یہ تو ہم اس لیے لیتے ہیں کہ تمہاری حفاظت کریں۔ جب ہم تمہاری حفاظت نہ کر سکے۔ تو ہم ان رقوم کے بھی حقدار نہیں[1]۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے عیسائیوں کا مقابلہ کیا۔ کیونکہ انہوں نے حریت کو پایا۔ اور سمجھ لیا کہ ہم غلام نہیں۔ اور نہ ہمیں غلام سمجھا جاتا ہے ساتھ ہی وہ حریت جو حد سے بڑھی ہوئی تھی اس کو کم کیا۔ ایک طرف تو حریت فکر قائم کی۔ اور ایک مسلم کے لیے فرض رکھا کہ وہ اپنے فکر کو چلائے۔ جہاں تک کہ اخلاق اور مذہب اجازت دیں۔ مذہب کے پرکھنے کے لیے خوب آزادی سے کام لے، لیکن جب پرکھ کر معلوم کرے کہ فلاں مذہب حق ہے۔ تو پھر اس کی پابندی اختیار کرے۔ فرمایا: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ ہر شخص حق رکھتا ہے کہ وہ ظاہر کرے۔ جو اس کے خیالات ہیں، لیکن جب اس کو معلوم ہو جائے کہ یہ حکم خدا اور خدا کے رسول اور ان کے قائم مقاموں کی طرف سے ہے تو پھر کامل اطاعت کرے۔ اگر کوئی جھگڑے کی بات ہو تو اللہ اور اس کے رسول سے فیصلہ کرائے۔ یہ درمیانی طریق تھا۔ وہ لوگ جو آزاد مطلق تھے۔ ان کو مقید کیا اور ان کو آزادی دی۔ جو بالکل مقید تھے۔ جب تک اسلام کے اس پیش کئے ہوئے طریق پر قدم نہ مارا جائے، ترقی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ جب لوگ غلام ہونگے اور حُریت فکر اور حُریت عمل سے بالکل محروم ہونگے، اور رسم و عادات کے بندے ہونگے۔ اور جو کچھ انہوں نے باپ دادا سے سُن رکھا ہوگا۔ اسی پر عمل کرنے کو موجب نجات و فلاح سمجھتے رہیں گے۔ وہ کچھ بھی نہیں حاصل کر سکیں گے، بلکہ مٹ جائیں گے۔ اور اسی وقت سے مسلمان گرنے شروع ہو گئے۔ اور ان کی اُمیدیں نامرادی سے مبدل ہو گئیں، جب وہ اسی خیال کے پابند ہو گئے۔

---

[1] کتاب الخراج للامام ابو یوسف بحوالہ پریچنگ آف اسلام مصنفہ ٹامس آرنلڈ

اور اس کے مقابلہ میں یورپ کے فلسفہ سے متاثر ہو کر ہر شرعی حکم کو غلط ٹھہرانے والے یا ان پر جرح کرنیوالے بھی غلطی کرتے ہیں۔ غیر تو غیر مسلمانوں میں اس قسم کے لوگ ہیں۔ جو کہدیتے ہیں۔ کہ نماز ایک فضول چیز ہے۔ یہ تو ان لوگوں کے لیے تھی۔ جن پر تہذیب کی روشنی نہ پڑی تھی۔ اور جبکہ ابھی تہذیب تمدن کمال کو نہ پہنچے تھے۔ یہ عرب کے وحشیوں کو پابند کرنے کے لیے ایک متوہمانہ طریق تھا جس سے وہ خیال کرتے تھے کہ ہم ان حرکات کے ذریعہ خدا کے سامنے ہو جاتے، لیکن اب ہم سمجھ گئے ہیں۔ اس لیے ان ظاہری حرکات کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں ہیں جو کہدیتے ہیں۔ کہ وضو کی کوئی ضرورت نہیں یہ ان لوگوں کے لیے تھا۔ جو نہانے دھونے کے پابند نہ تھے۔ اب شرفاء اور یورپ کے تعلیم یافتہ پاک صاف رہتے ہیں۔ اس لیے وضوء کی بھی انہی کے لیے ضرورت تھی۔ ہمارے لیے نہیں۔ اسی طرح روزے کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ روزہ کیا ہے۔ محض فاقہ کشی جس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم خدا کی عظمت کے لیے یہ تو کر لیا کرینگے۔ کہ ڈنر دن میں نہ کیا کریں۔ صرف چاء دن میں دو تین دفعہ پی لیا کرینگے۔ جس کے ساتھ چند بسکٹ بھی کھائیں گے۔ سارا دن فاقہ کرنے کا کیا فائدہ۔

غرض جس قدر احکام شریعت تھے۔ ان سب کے متعلق کہدیا کہ ہم خوب سمجھ گئے ہیں۔ یہ تمام باتیں محض ڈرانے اور مرعوب کر کے خدا کی طرف متوجہ کرنے کے لیے تھیں۔ حالانکہ نماز قید نہ تھی۔ اور روزہ بھوکا مارنے کے لیے نہ تھا۔ اگر یہ بات ہوتی۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے۔ کہ جو شخص روزہ رکھتا ہے۔ مگر اپنی زبان اپنی آنکھ، اپنے ہاتھ، اپنے پاؤں کو قابو نہیں رکھتا۔ تو یہ محض فاقہ کشی ہوگی[1]۔ پھر قرآن کریم روزے کے متعلق یہ نہ فرماتا۔ کہ اگر تم روزہ رکھو گے۔ تو تم کو تقویٰ نصیب ہو جائے گا[2]۔ نماز وہم کے لیے نہ تھی۔ نہ وحشیوں کو ظاہری شکل سے متوہم اور متاثر کرنے کے لیے تھی۔ بلکہ نماز میں جس قدر حرکات ہیں۔ وہ سب اپنے اندر حکمتیں پوشیدہ رکھتی ہیں اور ہر حرکت کے روحانی فوائد مرتب ہوتے ہیں اور یہ تمام باتیں روحانی ترقی کیلئے ممد ہیں۔ اسلام نے کوئی حکم ڈرانے کیلئے نہیں دیا۔ بلکہ اسلام نے جسقدر احکام دیتے ہیں وہ سب کے سب رُوحانی ترقی کے لیے ضروری اور لابدی ہیں۔ نماز کی ہر ایک حرکت رُوحانیت کو بڑھاتی ہے روزہ بھوکا مارنے کے لیے نہیں۔ رُوحانیت کو ترقی دینے کے لیے ہے۔ زکوٰۃ و صدقات محض حکومت کے انتظام میں مدد دینے کے لیے نہیں۔ بلکہ رُوحانیت کے لیے ہے۔ اسی طرح وضوء میں بھی یہی بات ہے۔ پس وضو ان لوگوں کے لیے نہیں۔ جن کو وحشی کہا جاتا ہو یا جو گندے رہتے ہوں۔ بلکہ ان

---

[1] بخاری بروایت مشکوٰۃ کتاب الصوم باب تنزیہ الصوم ؛ [2] البقرہ : ۱۸۴

کے لیے ہے اور سب کے لیے جو نہاتے دھوتے صاف ستھرے رہتے ہوں۔ صحابہ میں سے بہت سے ہیں جو روزانہ غسل کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے متعلق آتا ہے۔ کہ وہ روزانہ غسل کرتے تھے وہ گندے نہ تھے، مگر روزانہ وضو کرتے تھے۔ اسلام نے ناپاکی کو مٹایا اور پاکیزگی کو قائم کیا۔ پس وضو صرف پاکیزگی کے لیے نہیں۔ بلکہ رُوحانیت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

جس وقت تک تو یورپ سے آواز آرہی تھی کہ وضو وغیرہ کام محض جاہلوں کو پاک کرنے کیلئے ہوتے تھے ان سے متاثر لوگ بھی یہی آواز اُٹھاتے تھے۔ اور وضو وغیرہ کاموں کو لغو ٹھہراتے تھے مگر اب یورپ نے اس کے خلاف آواز اُٹھانی شروع کی ہے۔ اعصاب کے متعلق جو تازہ تحقیقات ہوئی ہے وہ بتلاتی ہے کہ ہاتھ پاؤں اور منہ کو گیلا کرنے سے دماغی حالت میں تغیر پیدا ہوجاتا ہے۔ دماغ میں جو طاقت ہے۔ اس میں گرمی پیدا ہو کر آنکھوں اور ہاتھوں وغیرہ کے ذریعہ بہتی جاتی ہے لیکن جب ان اعضاء کو ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے۔ تو ایک سکون پیدا ہو کر توجہ اور یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن ہم اس کے محتاج نہیں۔ کیونکہ جو شخص ایک کام کے فوائد کو تجربہ کر کے دیکھ لے۔ اس کے لیے کوئی تحقیق زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ہم ہر روز روٹی کھاتے ہیں۔ اور ابتداء سے لوگ کھاتے چلے آئے ہیں۔ اب یورپ ہزار تحقیقاتیں کرے۔ اور بتاتے کہ خوراک کے اقسام اور ان کے ہضم ہونے کے اوقات اور ان کے اثرات۔ مگر ان سے روٹی کے مفید ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ کیونکہ روٹی کے فوائد تجربہ میں آگئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ یورپ کے مہذبوں کے دانت چالیس برس میں گرجاتے یا گرنے شروع ہو جاتے ہیں، مگر وہ لوگ جو ان کے تجارب اور تحقیقاتوں سے آگاہ نہیں۔ ان کے دانت مدتوں تک سلامت رہتے ہیں۔ پس باوجود اس کے کہ لوگ خوراک کی تعریف سے ناواقف تھے مگر مختلف خوراکیں استعمال کرتے تھے اور ان سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ کیونکہ تجربہ ان کا مفید ہونا ثابت کرتا تھا۔ پس جو باتیں تجربہ سے ثابت ہوں۔ ان کے متعلق انسان علم اور تحقیقات سے وسعت خیال پیدا کر سکتا ہے، لیکن تجربہ پر ان کا اور کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ اسی طرح مغربی تحقیقاتیں ہمارے خیالات میں وسعت کا موجب ہو سکتی ہیں۔

علمِ نفس سے انسان چیزوں کو پہچان سکتا ہے۔ مگر یہ چیزیں اس علم کی وجہ سے بڑھ نہیں سکتیں مثلاً نفس والوں نے ہر ایک چیز کی تعریف بتا دی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ پہلے لوگ تعریف نہ جانتے تھے انہوں نے اس کے اقسام بتا دیئے۔ اور ظاہر کر دیا کہ دماغ کی اس قدر کیفیات ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک توہم ہوتا ہے۔ ایک تصور۔ ایک شعور ہوتا ہے۔ ایک احساسات ہوتے ہیں۔ ایک جذبات وغیرہ وغیرہ جب

سائیکلوجی کا علم نہیں نکلا تھا۔ اس وقت بھی لوگوں میں یہ باتیں تھیں۔ اور لوگ ان سے کام لیتے تھے مگر ان کو نام معلوم نہ تھے۔

اسی طرح ہم زبانوں کو دیکھتے ہیں۔ مثلاً عربی گرامر جب پیدا ہوئی۔ اس کے قبل کی زبان کو اگر دیکھا جائے تو وہ زیادہ اعلیٰ درجہ کی ہے بہ نسبت بعد کی زبان کے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زبان کو صرف و نحو نے مدد نہیں دی۔ البتہ غیر شخص کے لیے جو اس زبان کو سیکھنا چاہے۔ سیکھنے میں مؤید ہو سکتی ہے مگر اہلِ زبان کے لیے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح نماز پڑھنے والے کے لیے ان باتوں کا معلوم ہونا کہ وضو کے یہ فوائد ہیں۔ اور فلاں بات کے یہ۔ سوائے اس کے علم کو بڑھانے کے اور کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی۔

غرض یہ ایک غلطی تھی۔ کہ اوّل تو لوگ ہر قسم کی آزادی سے محروم تھے۔ دوسرے انتہاء درجے کے آزاد تھے۔ اسلام نے وسطی طریق بتایا۔ اور اُصول بتا دیئے کہ کہاں تک آزادی ہے اور کہاں تک قید آج کل لوگ آزادی کے غلط معنے سمجھنے کی وجہ سے کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ ہم تو فلاں شخص کے منہ پر فلاں بات کہہ دیں۔ اس قسم کی باتیں فساد کا موجب ہوتی ہیں۔ کیونکہ ایسی حالت میں فطرت مقابلہ کے لیے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ کوئی حد ہو۔ خصوصاً ایک معلم کے لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے لیے علم مہیا کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک شخص جو جنگل میں ہو اور تمدن نے اس پر کوئی اثر نہ ڈالا ہو۔ اوّل تو اس میں جھوٹ کی عادت نہ ہو گی۔ تاہم اگر وہ جھوٹ بولے گا۔ تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو بتلانے والا نہ تھا، لیکن جس کو بتایا گیا ہو۔ وہ اگر جھوٹ کا مرتکب ہو تو وہ قابلِ ملامت ہوگا۔ پس ایک مسلمان کو تمام وہ باتیں جو اسے بجا لانی چاہئیں۔ خدا نے بتا دی ہیں اور پھر اس کے رسول نے ان کی شرح کر دی ہے۔ پھر ائمہ نے ان کی مزید شرح کر دی ہے، اب ایک مسلم کے لیے ترقی کا رستہ کھلا ہے۔ اس کو قدم اُٹھانا چاہیئے اور ان ہدایات پر عمل کرنا چاہیئے۔ جو اسلام نے اس کو دی ہیں۔ اگر یہ ان ہدایات اور اس قدر روشنی کے باوجود گرتا ہے۔ تو یہ زیادہ الزام کے نیچے ہے کیونکہ جو شخص اندھیرے میں چلتا ہوا ٹھوکر کھا کر گرتا ہے۔ وہ مجبور ہے لیکن وہ شخص جس کیلئے ہدایت کا سورج چڑھایا گیا اس کیلئے گرنے کا مقام نہ تھا اسکو چاہیئے تھا کہ وہ غور کرتا اور ان ہدایتوں پر عمل کرتا۔ جو اللہ اور اللہ کے رسول اور اسکے نائبوں نے اسکے سامنے رکھیں مسلمانوں کی یہ مثال ہے جیسے ایک شخص اجنبی شہر میں جاتے۔ مگر اس کے ساتھ ایک گائیڈ (رہبر) ہو۔ اس کو اس شہر کے جن جن مقامات کی سیر کرنی ہو گی۔ وہ بہت آسانی سے دکھلا دے گا، لیکن اگر یہ اس گائیڈ

کے ہوتے ہوئے پھر اُلٹے رستوں اور گلیوں میں ٹھوکریں کھاتے تو گائیڈ کا کیا قصور۔ اس کی بدقسمتی ہوگی۔ پس جس کے لیے ہدایت نہیں آئی۔ اگر وہ ٹھوکریں کھاتے۔ تو وہ مجبور ہے۔ مگر مسلم کے لیے تو ہدایت آگئی۔ اس کے سامنے راستہ روشن ہے۔ اگر یہ گرے یا بھولے تو اس کا عذر معقول نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سب کو توفیق عنایت کرے کہ اس کے تجربہ کئے ہوئے احکام پر عمل کریں۔ اور پھر ترقیات نصیب کرے۔ جو سچے مومنوں کے لیے اس نے قرار دی ہیں۔ آمین ؎

(الفضل ۸ر جنوری ۱۹۲۰ء)